OPEN ACCESS
Al-ISRA
International Journal of Islamic Thought
ISSN: 2959-3603
www.israjr.com

Al-ISRA
Vol.:5, Issue: 1, Jan -March 2026 PP: 95-109

پاکستان میں دینی سیاسی جماعتوں کی معاصر حکمت عملی واثرات: تحقیقی و تنقیدی جائزہ

Contemporary Strategies and Impacts of Religious Political Parties in Pakistan: A Critical and Analytical Study

Sheikh Muhammad Mushtaq
Ph.D. Scholar, Department of Islamic Studies, Riphah International University, Faisalabad Campus, Faisalabad
Email: sheik@gmail.com

Prof. Dr. Khalid Mahmood Arif
HOD, Dept. of Islamic Studies, Riphah International University, Faisalabad, Pakistan
Email: khalid.mahmood@riphahfsd.edu.pk

Abstract

This study offers a critical and analytical examination of the contemporary strategies and socio-political impacts of religious political parties in Pakistan within the evolving political landscape of the twenty-first century. Historically, religious parties have played a significant role in shaping Pakistan's ideological discourse, state policies, and societal norms. However, changing global dynamics, democratic pressures, media transformations, and internal political challenges have compelled these parties to recalibrate their strategies. The paper explores how major religious political actors such as Jamaat-e-Islami, Jamiat Ulema-e-Islam (F), Jamiat Ulema-e-Islam (S), Jamiat Ulema-e-Pakistan, Markazi Jamiat Ahl-e-Hadith Pakistan, Tehreek-e-Labbaik Pakistan, and Sunni Tehreek Pakistan have adopted diverse approaches combining parliamentary participation, street power, welfare activism, ideological training, madrassa networks, and digital media engagement. While some parties emphasize gradualist politics, institutional reform, and social welfare, others rely on protest-based mobilization, emotive religious symbolism, and mass street pressure to influence state decisions. Through a comparative analysis, the study highlights how these varied strategies have produced distinct forms of political influence ranging from legislative and ideological impact to public opinion shaping and state-society negotiation. The paper also critically

CC BY

assesses the limitations faced by these parties, including electoral underperformance, internal fragmentation, leadership crises, and tensions between democratic norms and confrontational politics. The study concludes that religious political parties in Pakistan cannot be understood as a monolithic force; rather, they represent a complex, evolving spectrum of ideological commitments, organizational capacities, and strategic choices that continue to shape Pakistan's political and religious discourse.

Keywords: *Religious Political Parties in Pakistan, Political Islam, Contemporary Religious Politics, Street Power and Protest Politics, Parliamentary Islamism, Madrassa Networks, Sectarian Dynamics, State-Religion Relations.*

تمہید

برصغیر کی سیاسی و مذہبی تاریخ میں یہ جماعتیں ہمیشہ سے ریاستی و سماجی دھاروں کو متعین کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتی رہی ہیں تاہم اکیسویں صدی کے بدلتے سیاسی و عالمی منظر نامے نے ان کے لائحۂ عمل اور فکری ترجیحات میں نئی جہتیں پیدا کی ہیں۔ ان جماعتوں نے ایک طرف اسلامی شریعت اور خلافت کے قیام جیسے روایتی نعروں کو برقرار رکھا تو دوسری طرف جمہوریت، پارلیمانی سیاست، سماجی خدمت اور ڈیجیٹل ذرائع ابلاغ کے استعمال کو اپنی پالیسی کا حصہ بنایا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں داخلی و خارجی سطح پر چیلنجز کا بھی سامنا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینی سیاسی جماعتوں کی معاصر حکمتِ عملی کو سمجھنا پاکستان کی سیاست، سماج اور مذہب کے باہمی تعلقات کے تجزیے کے لیے ناگزیر ہے۔

جماعت اسلامی کی حکمتِ عملی اور اثرات

پاکستان میں مذہبی سیاسی جماعتوں کی معاصر حکمتِ عملی میں جماعت اسلامی کا انداز دیگر دینی جماعتوں سے واضح طور پر مختلف ہے۔ اس نے ایک طرف اصولی سیاست، فکری اصلاح اور سماجی خدمت کو باہم مربوط رکھا اور دوسری طرف فرقہ وارانہ جھگڑوں اور انتہاپسند بیانیے سے خود کو الگ رکھا۔ یہ دوہرا امتزاج جماعت اسلامی کو ایک "متوازن نظریاتی جماعت" کی حیثیت عطا کرتا ہے جو معاصر ریاستی و معاشرتی نظام میں اسلامی فکر کا متبادل فراہم کرتی ہے۔ مولانا مودودی کے وضع کردہ "اسلامی ریاست" کے فکری تصور کو اس جماعت نے نہ صرف علمی سطح پر جاری رکھا بلکہ تنظیمی سطح پر بھی اس کی عملی تعبیر کی کوشش کی۔

جماعت اسلامی کی معاصر حکمت عملی میں ایک نمایاں پہلو سیاست میں تدریجی شراکت اور تنقیدی موجودگی ہے۔ اگرچہ جماعت نے مختلف ادوار میں حکومتوں کے ساتھ اتحاد کیے، مگر وہ شخصی مفادات کی سیاست سے ہمیشہ دور رہی۔ اس کا انتخابی مؤقف ہمیشہ اصولی رہا اور اقتدار کے لیے سودے بازی کی سیاست اس کی پالیسی کا حصہ نہ بنی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے سیاسی کردار میں اعتماد اور یکسانیت موجود ہے، جو اسے دینی جماعتوں کے عمومی مزاج سے ممتاز بناتی ہے۔ جیسے عبدالحفیظ خان رقم طراز ہیں:

"پاکستان کی سیاست میں جماعت اسلامی ایک ایسی مذہبی جماعت رہی ہے جس نے اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ چاہے وہ فوجی آمریت ہو یا جمہوری نظام، جماعت نے اپنے مؤقف کو علمی و شرعی بنیادوں پر قائم رکھا اور اسی تسلسل نے اس کے کارکنان کو فکری استقامت عطا کی۔ جماعت کی موجودگی نے سیاست کو محض اقتدار کی دوڑ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے اخلاقی اصولوں کا

پابند بنانے کی سعی کی۔[1]

اس اقتباس سے جماعت اسلامی کے اس امتیازی وصف کی خصوصیت نمایاں ہوتی ہے۔ جماعت اسلامی کی دوسری بڑی حکمت عملی ادارہ جاتی تعمیر و تربیت پر مرکوز ہے۔ اسلامی جمعیت طلبہ، شعبہ خواتین، الخدمت فاؤنڈیشن اور دیگر ذیلی ادارے نہ صرف جماعت کے دائرۂ اثر کو وسیع کرتے ہیں بلکہ معاشرے میں اس کے فکری اور عملی کردار کو پائیدار بناتے ہیں۔ ہر کارکن ایک منظّم تعلیمی و روحانی تربیت سے گزرتا ہے جس سے ایک مضبوط داخلی ڈھانچہ وجود میں آتا ہے۔ جماعت نے فرد سازی کو مرکز بنایا اور اسی فرد کی صلاحیت کو تنظیم اور دعوت کے لیے وقف کیا۔ جیسا کہ خلیل الرحمٰن چشتی بیان کرتے ہیں:

"جماعت اسلامی کی داخلی طاقت کا سرچشمہ اس کا تربیتی نظام ہے۔ ہر کارکن دعوتِ دین کے مقصد کو نہ صرف جانتا ہے بلکہ اس پر یقین رکھتا ہے۔ یہ یقین شعوری بھی ہے اور عملی بھی۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو جماعت کے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور یہی چیز اس کی تنظیم کو دیگر مذہبی گروہوں سے مختلف کرتی ہے جو صرف نعرے بازی یا احتجاجی مہمات پر انحصار کرتے ہیں۔"[2]

اس تربیت کا اثر اس وقت اور بھی نمایاں ہوتا ہے جب ہم جماعت اسلامی کے سماجی فلاحی کردار کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ الخدمت فاؤنڈیشن کے تحت جس منظّم انداز میں تعلیم، صحت، پانی، کفالتِ یتامیٰ اور دیگر منصوبے چلائے جارہے ہیں، وہ نہ صرف اس کی عملی صلاحیتوں کا اظہار ہیں بلکہ یہ اس کی خدمت خلق کی غیر سیاسی تعبیر بھی ہیں، جو عامۃ الناس میں اس کی ساکھ کو بلند کرتی ہیں۔ یٰسین ظفر اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الخدمت کا نظام محض رفاہی سرگرمی نہیں بلکہ ایک تصوراتی ڈھانچے کا عملی مظہر ہے۔ اس کی خدمات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلامی فلاحی ریاست کی تشکیل کا خواب صرف نعروں سے ممکن نہیں بلکہ ایک مضبوط تنظیم، تربیت یافتہ کارکنان اور شفاف نظم وضبط کے بغیر یہ محض تصور ہی رہتا ہے۔ جماعت اسلامی نے اس میدان میں مثالی ماڈل پیش کیا ہے۔"[3]

ریاستی پالیسی پر اثر کے ضمن میں جماعت اسلامی کا کردار براہِ راست حکومتی قانون سازی میں نمایاں نہ سہی، مگر اس نے نظریاتی، عدالتی اور عوامی سطح پر دباؤ کا تسلسل قائم رکھا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل میں اس کی موجودگی، نصاب سازی میں اس کا مؤقف، سودی نظام کے خلاف جدوجہد اور میڈیا پر اخلاقی ضوابط کا مطالبہ، اس کے دیرپا اثرات کا حصہ ہیں۔ ان اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے سلمان احمد لکھتے ہیں:

"اگرچہ جماعت اسلامی کو وزارت عظمیٰ یا اکثریتی اقتدار حاصل نہیں ہوا، مگر اس کی فکری موجودگی نے ریاستی اداروں کو متاثر ضرور کیا۔ اس کے کارکن مختلف شعبوں میں ایک ایسے اسلامی بیانیے کے نمائندہ بن کر موجود ہیں جو نظریاتی تسلسل کو زوال سے بچائے ہوئے ہے۔ یہی وہ غیر مرئی اثر ہے جو جماعت کو ایک فکری واخلاقی قوت کے طور پر برقرار رکھے ہوئے ہے۔"[4]

بین المسالک ہم آہنگی کے میدان میں بھی جماعت اسلامی کا طرزِ عمل ہمیشہ قابلِ تقلید رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ قومی وحدت کو فوقیت دی اور مسلکی تقسیم سے اجتناب کیا۔ اس کا بیانیہ امت کے مشترکہ اصولوں پر مبنی رہا ہے، جس کی بنا پر مختلف مسالک کے اہلِ علم میں اسے علمی و نظریاتی قبولیت حاصل ہوئی۔ جیسا کہ مفتی نعمان احمد وضاحت کرتے ہیں:

"جماعت اسلامی نے فقہی اختلافات کو کبھی سیاسی مفادات کے لیے استعمال نہیں کیا، بلکہ ان اختلافات کو علمی دائرے میں رکھا۔ ان کا بیانیہ تمام مکاتب فکر کے لیے دعوتِ فکر کا حامل رہا ہے اور ان کی جماعت میں ہم آہنگی کی وہ فضا موجود رہی ہے

جس میں اختلاف کے باوجود باہمی احترام کو مقدم رکھا جاتا ہے۔"[5]

جماعت اسلامی کی معاصر حکمتِ عملی جو کہ انتخابی شراکت، فکری تربیت اور سماجی خدمت کا مربوط امتزاج ہے نے پاکستان کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی میدان میں ایک مستقل اثر مرتب کیا ہے۔ اگرچہ اسے انتخابی کامیابی کم ملی مگر فکری تسلسل، اصولی سیاست اور منظّم ادارہ جاتی ڈھانچہ اس کی طاقت رہے ہیں۔ اس کا غیر انتہاپسند رویہ، فرقہ واریت سے اجتناب اور عملی اخلاقی کردار پاکستان کی دینی سیاست میں ایک متوازن ماڈل کے طور پر ابھرا ہے، جو وقت کے ساتھ مزید اہمیت اختیار کر رہا ہے۔

جمعیت علماء اسلام (ف) کی حکمتِ عملی اور اثرات

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں میں جمعیت علماء اسلام (ف) کو سب سے مؤثر، متحرک اور سیاسی طور پر کامیاب جماعت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی قیادت مولانا فضل الرحمٰن جیسے تجربہ کار، پارلیمانی اور ریاستی معاملات سے واقف رہنما کے ہاتھ میں ہے جو مذہبی طبقے کو جدید جمہوری سیاست میں مؤثر نمائندگی دلانے کے ساتھ ساتھ مذہب کو ریاستی پالیسیوں میں جگہ دلوانے کی مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں۔ جمعیت علماء اسلام (ف) کی معاصر حکمتِ عملی کو تین بنیادی دائرہ ہائے عمل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

- انتخابی و پارلیمانی سیاست میں شمولیت
- ریاستی اداروں سے عملی رابطہ کاری
- مذہبی حلقوں کو متحرک رکھ کر دینی بیانیے کی سیاسی و سماجی حفاظت۔

سب سے نمایاں حکمت عملی اس جماعت کی انتخابی سیاست میں بھرپور شرکت اور اتحاد سازی کی صلاحیت ہے۔ جے یو آئی (ف) نے 2002ء میں متحدہ مجلس عمل (MMA) کے بینر تلے خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں صوبائی حکومتیں قائم کیں اور مرکزی سطح پر بھی اپنی عددی موجودگی کو مؤثر سیاسی دباؤ کے لیے استعمال کیا۔ اس جماعت نے اپنے مضبوط مذہبی ووٹر بیس، مدارس کے فارغ التحصیل حلقوں اور دیہی قبائلی سوسائٹی کے ساتھ روابط کو انتخابی کامیابی کے لیے ایک منظّم قوت میں بدل دیا۔ ڈاکٹر شاہد حسن رضوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"جمعیت علماء اسلام (ف) پاکستان میں وہ واحد دینی جماعت ہے جو انتخابی سیاست کو محض نمائشی عمل نہیں سمجھتی بلکہ اسے اپنے دینی فکر کی تعبیر کا ذریعہ بناتی ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن کی سیاسی بصیرت نے اس جماعت کو متحرک رکھا، جو اپنے روایتی مذہبی ووٹ کو سیاسی اتحادوں، حلقہ جاتی حمایت اور علاقائی توازن کے ساتھ جوڑ کر ایک مؤثر قوت کے طور پر سامنے لائی۔"[6]

پارلیمانی سیاست میں اس جماعت کی مستقل موجودگی نے اسے ریاستی اداروں، بیوروکریسی اور عدلیہ تک رسائی دی، جسے اس نے کئی مواقع پر قانون سازی، اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل اور نصاب و مذہبی شعائر سے متعلق امور پر اثرانداز ہونے کے لیے استعمال کیا۔ خاص طور پر مذہبی آزادی، ختم نبوت کے قوانین، حدود آرڈیننس کی بحالی اور پارلیمانی قراردادوں میں مذہبی اصطلاحات کا تحفظ، اس جماعت کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر اس پہلو کو یوں بیان کرتے ہیں:

"جے یو آئی (ف) کا کردار محض احتجاج یا دھرنوں تک محدود نہیں بلکہ وہ عملی طور پر ریاست کے ان تمام فورمز میں موجود رہی جہاں قانون سازی، نصاب سازی یا مذہبی شعائر کا تحفظ درکار تھا۔ مولانا فضل الرحمٰن کا ادارہ جاتی رسوخ اور قانونی نکات پر دسترس انہیں ایک ایسے مذہبی سیاستدان کی حیثیت سے نمایاں کرتا ہے جو بات کرنا جانتا ہے اور اداروں سے بات منوانا بھی جانتا ہے۔"[7]

جے یو آئی (ف) نے اپنی معاصر حکمت عملی میں احتجاجی سیاست کو بھی نیا رنگ دیا۔ 2019ء کا آزادی مارچ اور دیگر دھرنے، جن میں ہزاروں مدارس کے طلبہ، علما اور کارکنان شریک ہوتے رہے، اس بات کا ثبوت ہیں کہ جماعت کے پاس ایک متحرک "سٹریٹ پاور" بھی موجود ہے۔ اس احتجاجی دباؤ نے حکومت وقت کو نہ صرف دباؤ میں رکھا بلکہ اس سے جماعت کو مذاکرات کی میز پر بھی باوقار جگہ ملی۔ اگرچہ بعض ناقدین نے اسے نظام کو بلیک میل کرنے کی کوشش قرار دیا، لیکن جماعت کے نزدیک یہ آئینی حق کا استعمال اور دینی طبقے کی آواز کو مرکزی دھارے تک پہنچانے کا ذریعہ تھا۔ خالد علی خان اس کیفیت کا تجزیہ کچھ یوں کرتے ہیں:

"جمعیت علماء اسلام (ف) کے دھرنے اور آزادی مارچ اس بات کی علامت ہیں کہ یہ جماعت ایک طرف تو ریاست کے اندر ادارہ جاتی عمل میں شریک ہے اور دوسری طرف وہ عوامی دباؤ سے اپنے مطالبات منوانے کی اہلیت بھی رکھتی ہے۔ مذہبی سیاست میں احتجاج کو جس نظم و ضبط اور حکمت سے استعمال کیا گیا، وہ دیگر جماعتوں کے لیے بھی قابل غور مثال بن چکی ہے۔"[8]

جے یو آئی (ف) کی معاصر حکمتِ عملی میں ایک اور نمایاں پہلو مدارس اور عوامی مذہبی مزاج سے مربوط رہنا ہے۔ دینی مدارس اس جماعت کی ریڑھ کی ہڈی ہیں، جن کے ذریعے نہ صرف فکری و عددی سپورٹ میسر آتی ہے بلکہ سماجی رسوخ بھی قائم رہتا ہے۔ جماعت نے جدید تقاضوں کے پیش نظر ان مدارس کو تنظیمی ڈھانچے کے اندر رکھتے ہوئے انہیں تعلیمی و تربیتی محاذ پر فعال رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ عوامی مذہبی جذبات کو مجروح کیے بغیر، ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی کوشش بھی جاری رکھی ہے۔ عبدالشکور علوی اس نکتے پر تبصرہ کرتے ہیں:

"جمعیت علماء اسلام (ف) نے دینی مدارس کو نہ صرف اپنی فکری طاقت کے طور پر استعمال کیا بلکہ ان کے ذریعے دیہی، قبائلی اور مذہبی سماج میں ایک باوقار سیاسی نیٹ ورک قائم کیا۔ اس جماعت کا بیانیہ محض سیاست تک محدود نہیں بلکہ عوام کے مذہبی احساسات اور تشخص کے ساتھ مربوط ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ نہایت حساس معاملات پر بھی مذہبی جذبات کی رہنمائی میں کامیاب رہی ہے۔"[9]

جمعیت علماء اسلام (ف) نے معاصر دینی سیاست میں ایک ایسی حکمتِ عملی اختیار کی ہے جو بیک وقت ادارہ جاتی سیاست، احتجاجی قوت، مذہبی حلقوں کی حمایت اور ریاستی مذاکراتی عمل سے جڑی ہوئی ہے۔ اس کی قیادت نے جذباتیت سے ہٹ کر پارلیمانی بصیرت، عوامی رسوخ اور دینی تشخص کا ایسا امتزاج پیدا کیا ہے جو اسے دیگر جماعتوں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس جماعت کا طرزِ سیاست اگرچہ تنقید سے مبرا نہیں، مگر اس کی ریاستی اثر پذیری، دینی بیانیے کی حفاظت اور تنظیمی موجودگی پاکستان کی معاصر دینی سیاست میں ایک نمایاں اور مؤثر مقام کی نشاندہی کرتی ہے۔

جمعیت علماء اسلام (س) کی حکمتِ عملی اور اثرات

جمعیت علماء اسلام (س) یا جے یو آئی (س) کا قیام جمعیت علماء اسلام (ف) سے فکری و تنظیمی اختلافات کے بعد عمل میں آیا، جس کی قیادت علامہ مولانا سمیع الحق نے سنبھالی۔ اگرچہ اس جماعت کا دائرۂ اثر جے یو آئی (ف) کے مقابلے میں محدود رہا، تاہم معاصر مذہبی سیاست میں اس کی پہچان چند اہم نکات پر مرکوز رہی: مدارس دینیہ سے گہرا رشتہ، جہادی تنظیمات کے ساتھ نظریاتی قربت اور افغان پالیسی میں فعال مداخلت۔ سمیع الحق کو "بابائے طالبان" کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے، جس کی بنیاد ان کے دارالعلوم اکوڑہ خٹک سے فارغ التحصیل طالبان قیادت پر ہے۔

جے یو آئی (س) کی معاصر حکمتِ عملی کا پہلا نمایاں پہلو افغان پالیسی اور جہادی بیانیے سے قربت ہے۔ مولانا سمیع الحق نے افغان طالبان کے ساتھ نظریاتی اور تربیتی تعلق برقرار رکھا اور پاکستان میں ان کی سیاسی و اخلاقی حمایت کا بیانیہ کھل کر بیان کیا۔ اس حکمت عملی نے ایک طرف ریاستی اداروں کو، خاص طور پر فوج کو، مذہبی حلقے سے جوڑنے کا موقع دیا اور دوسری طرف عالمی سطح پر مذہبی سیاست کو بین الاقوامی جہاد کے بیانیے سے منسلک کر دیا۔ ڈاکٹر معراج الحق لکھتے ہیں:

"مولانا سمیع الحق کی جماعت نے افغانستان کے مسئلے کو محض خارجی معاملہ نہیں سمجھا بلکہ اسے ایک دینی و فکری جدوجہد کا تسلسل قرار دیا۔ ان کا دارالعلوم نہ صرف علمی ادارہ تھا بلکہ ایک نظریاتی مرکز بھی، جہاں جہادی فکر کو علمی استناد دیا جاتا تھا۔ یہی حکمت عملی جے یو آئی (س) کو دیگر مذہبی جماعتوں سے ممتاز کرتی ہے، جو محتاط بیانیہ اختیار کرتی ہیں۔"[10]

جے یو آئی (س) کی دوسری معاصر حکمتِ عملی انتخابی سیاست میں جزوی شمولیت اور اتحاد سازی رہی ہے۔ اگرچہ جماعت نے بڑے پیمانے پر انتخابات میں حصہ نہیں لیا، تاہم 2002ء میں متحدہ مجلس عمل (MMA) کا حصہ بنی اور کچھ نشستیں حاصل کیں۔ بعد ازاں 2018ء کے عام انتخابات میں تحریک انصاف کے ساتھ سیاسی اتحاد کیا، جسے جماعت کے لیے ایک اسٹریٹیجک فیصلہ سمجھا گیا۔ یہ حکمت عملی دیگر مذہبی جماعتوں کے برخلاف تھی جو پی ٹی آئی کو لبرل یا سوشل میڈیا پرست جماعت تصور کرتی تھیں۔ اس تعلق کے بارے میں عبدالحفیظ خان لکھتے ہیں:

"جے یو آئی (س) نے 2018ء میں تحریک انصاف سے اتحاد کر کے ثابت کیا کہ وہ سیاسی اصولوں کی بجائے اسٹریٹیجک پوزیشن کو فوقیت دیتی ہے۔ یہ اتحاد مذہبی اور غیر مذہبی قوتوں کے درمیان ایک نیا تجربہ تھا، جس میں جے یو آئی (س) نے امید کی کہ طالبان بیانیے کو عالمی سطح پر تسلیم دلوانے کے لیے ریاستی فورم تک رسائی ممکن ہو سکے گی۔"[11]

جہاں تک تنظیمی اثرات کا تعلق ہے جے یو آئی (س) کی تمام تر طاقت دارالعلوم حقانیہ کے گرد گھومتی رہی جو نہ صرف پاکستان بلکہ افغانستان میں بھی "مدرسہ دیوبند تحریک جہاد" کی علامت بن چکا ہے۔ اس ادارے کے فارغ التحصیل افراد نے متعدد اسلامی تحریکات میں عملی کردار ادا کیا جس کی بدولت یہ مدرسہ صرف ایک تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ ایک نظریاتی مرکز کی صورت اختیار کر گیا۔ ڈاکٹر احمد رفعت اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"دارالعلوم حقانیہ کا سیاسی و فکری کردار پاکستان کی مذہبی سیاست میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس ادارے سے وابستہ علماء نے جہاں نصاب و تربیت کے ذریعے مذہبی قیادت تیار کی، وہیں عالمی سطح پر بھی ایک مخصوص جہادی مزاج کی نمائندگی کی۔ جمعیت علماء اسلام (س) اس ادارے کو اپنی سیاسی فکر کا مرکز بنائے ہوئے ہے اور اسی کے ذریعے وہ اپنی حیثیت کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔"[12]

جے یو آئی (س) نے کبھی بھی سٹریٹ پاور پر زیادہ انحصار نہیں کیا اور نہ ہی مذہبی جذبات کو احتجاجی سیاست کی صورت میں نمایاں کیا، جیسا کہ تحریک لبیک کرتی ہے۔ اس کے برعکس، اس جماعت کا بیانیہ علمی اور فکری رہا، مگر ساتھ ہی ساتھ ریاستی اداروں کے ساتھ قربت نے اسے ایک "پس پردہ اثر" کی صورت میں مؤثر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف سیکیورٹی اور قومی سلامتی سے متعلق معاملات میں اس جماعت کو اعتماد میں لیا جاتا رہا ہے بالخصوص طالبان مذاکرات اور قبائلی امور کے باب میں۔ سمیع الحق کی شہادت کے بعد جماعت کی فعالیت میں کمی آئی ہے اور قیادت میں خلا محسوس کیا جا رہا ہے تاہم دارالعلوم اکوڑہ خٹک اب بھی اس جماعت کی نظریاتی علامت کے طور پر قائم ہے۔ ڈاکٹر نعمان رشید لکھتے ہیں:

"مولانا سمیع الحق کے بعد جماعت نے عوامی سیاست میں مؤثر کردار ادا کرنے کی رفتار کھو دی ہے، مگر دارالعلوم حقانیہ اب بھی اس کے نظریاتی اور تنظیمی وجود کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اگر قیادت میں کوئی متبادل بصیرت والا شخصیت سامنے نہ آئی تو یہ جماعت محض ایک فکری مرکز تک محدود ہو جائے گی۔"[13]

جمعیت علماء اسلام (س) نے معاصر دینی سیاست میں ایک مخصوص زاویے سے اثر ڈالا: جہادی بیانیے سے وابستگی، افغان پالیسی میں فعال کردار اور ریاستی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ قربت اس کی بنیادی خصوصیات تھیں۔ اگرچہ انتخابی میدان میں یہ جماعت محدود رہی مگر دارالعلوم حقانیہ کی بدولت اس کا فکری اثر پاکستان و افغانستان کے دینی و جہادی حلقوں میں اہم رہا۔ موجودہ دور میں قیادت کے بحران اور واضح سیاسی حکمت عملی کی عدم موجودگی کے باعث اس کے اثرات محدود ہو رہے ہیں، لیکن مدرسے کی سطح پر اس کی نظریاتی موجودگی اب بھی برقرار ہے۔

جمعیت علماء پاکستان کی حکمتِ عملی اور اثرات

پاکستان میں بریلوی مکتبِ فکر کے سیاسی و مذہبی اظہار کا ایک مضبوط اور تاریخی پلیٹ فارم جمعیت علماء پاکستان (JUP) رہا ہے جس کی تشکیل 1948ء میں مفتی محمد عبدالشکور، علامہ ابوالحسنات قادری اور علامہ احمد سعید کاظمی جیسے اہلِ علم کی قیادت میں ہوئی۔ اس جماعت کا مقصد اہلسنت کے عقائد و افکار کا سیاسی و سماجی سطح پر تحفظ اور فروغ تھا، جس میں ختمِ نبوت، ناموسِ رسالت اور عشقِ رسول ﷺ کے بیانیے کو مرکزی مقام حاصل رہا۔ اگرچہ 1980ء کے بعد جماعت اندرونی خلفشار اور قیادت کی تقسیم کا شکار ہوئی، لیکن اس کے نظریاتی تسلسل اور فکری اثرات آج بھی کئی طبقات پر موجود ہیں۔

معاصر دور میں جمعیت علماء پاکستان کی حکمت عملی کا پہلا نمایاں پہلو مذہبی شناخت اور عقائد اہلسنت کی سیاسی و قانونی سطح پر نمائندگی ہے۔ جماعت نے اپنے قیام سے لے کر اب تک جس تواتر سے عقیدہ ختمِ نبوتؐ، ناموسِ رسالتؐ اور میلادِ مصطفیٰ ﷺ جیسے عقائد کا دفاع کیا، وہ اس کی مذہبی سیاست میں پہچان بن چکے ہیں۔ ان عقائد کے تحفظ کو صرف مسلکی مسئلہ نہ بنا کر ریاستی بیانیے کا حصہ بنانے میں JUP کا کردار اہم رہا ہے۔ ڈاکٹر نعیم احمد کے مطابق:

"جمعیت علماء پاکستان نے مذہبی عقائد کو ریاستی آئینی شناخت سے ہم آہنگ کرنے میں جو کردار ادا کیا، وہ کسی اور جماعت کے لیے آسان نہ تھا۔ انہوں نے اپنے عقائد کو نہ صرف عوامی جلسوں میں زندہ رکھا بلکہ اسمبلیوں، عدالتوں اور میڈیا کے ذریعے ریاستی ڈھانچے میں اس کا اثر بھی منتقل کیا۔ یہ حکمتِ عملی اس لیے بھی کامیاب رہی کہ ان کے مؤقف میں عوامی جذبات، علمی استدلال اور مذہبی مقام کا حسین امتزاج موجود تھا۔"[14]

سیاسی حکمت عملی کے اعتبار سے JUP کی معاصر حیثیت نسبتاً محدود رہی ہے، مگر جماعت نے سیاسی اتحاد سازی، مخصوص تحریکات میں شمولیت اور نظریاتی بیانیہ کی موجودگی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز رکھا ہے۔ 1970ء کے انتخابات میں JUP نے قومی اسمبلی میں 7 نشستیں حاصل کیں جو اس کی سیاسی تاریخ کی اہم کامیابی تھی۔ بعد ازاں 1977ء میں تحریک نظام مصطفیٰ اور جنرل ضیاء الحق کے دور میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی تحریکات میں بھی اس نے سرگرم کردار ادا کیا۔ اگرچہ جماعت انتخابی کامیابی میں پیچھے رہی، لیکن اس کی نظریاتی موجودگی اور مختلف اتحادوں میں شرکت اسے مسلسل متحرک رکھتی رہی۔ ڈاکٹر طارق جاوید اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

"جمعیت علماء پاکستان نے کبھی انتخابی سیاست کو اقتدار کی جنگ نہیں بنایا۔ ان کا زور ہمیشہ اصولی بیانیے، عوامی جذبات کی

رہنمائی اور قانون سازی میں اخلاقی اثر پر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر سیاسی اتحاد میں ایک ایسی آواز کے طور پر شامل ہوتے رہے جو عشقِ رسالت، دینی شعائر اور مسلکی وقار کے لیے آواز بلند کرتی رہی۔"[15]

JUP کی معاصر حکمت عملی میں ایک اور نمایاں پہلو دینی مدارس، محافلِ میلاد اور مزارات سے جُڑا ہوا عوامی بیانیہ ہے۔ جماعت نے کبھی سٹریٹ پاور یا احتجاجی دھرنوں پر زیادہ انحصار نہیں کیا بلکہ عوامی مذہبی ثقافت کو منظّم کرنے کی کوشش کی۔ محافلِ نعت، عرس، اجتماعی محافلِ ختمِ قرآن اور تحریک تحفظِ ناموسِ رسالت کے عنوان سے منظّم اجتماعات اس کی طاقت رہے ہیں، جن کے ذریعے اس نے دینی ثقافت کو سیاسی سطح پر شناخت دی۔ سید افتخار نور لکھتے ہیں:

"JUP نے عوامی مذہبی جذبات کو شدت یا نفرت میں تبدیل کرنے کے بجائے، انہیں مہذب، جمالیاتی اور روحانی اسلوب کے ساتھ منظّم کیا۔ ان کے اجتماعات میں علمی گفتگو، روحانی کیفیات اور دینی شعائر کی عظمت کا امتزاج ہوتا ہے، جو عوام میں محبت اور عقیدت کے بیانیے کو فروغ دیتا ہے۔ یہی ان کی پُرامن سیاست کی بنیاد ہے۔"[16]

معاصر اثرات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اگرچہ JUP کا پارلیمانی اثر کمزور ہوا ہے مگر اس کے علمی و فکری اثرات کئی مذہبی طبقات میں نمایاں ہیں۔ پاکستان میں ناموسِ رسالت اور توہینِ رسالت کے قوانین کی عوامی اور قانونی حمایت، میلاد النبی ﷺ کو ریاستی سطح پر تسلیم کروانا، درود و سلام کو تعلیمی و انتظامی اداروں میں رائج کروانا یہ سب اس جماعت کے دیرینہ مطالبات اور کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ مفتی بشیر احمد قادری کے مطابق:

"اگرچہ JUP آج انتخابی میدان میں پیچھے ہے مگر اس کے اثرات تعلیمی نصاب، مذہبی ضوابط، سرکاری تقاریب اور عوامی مذہبی رویوں میں نمایاں ہیں۔ اس جماعت نے جو بیانیہ 1960ء کی دہائی میں متعارف کروایا، وہ آج ریاستی سطح پر تسلیم شدہ ہے۔"[17]

مزید یہ کہ JUP نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے میں بھی اعتدال پسند کردار ادا کیا۔ اس کا مسلکی تشخص نمایاں ہونے کے باوجود اس نے دوسرے مکاتبِ فکر کے ساتھ عملی اشتراک کی کوشش کی خصوصاً سنی اتحاد کونسل جیسے پلیٹ فارم کے ذریعے۔ البتہ یہ بات بھی حقیقت ہے کہ اندرونی انتشار، قیادت کی تقسیم (نورانی گروپ، نیازی گروپ) اور تنظیمی کمزوریوں کے باعث جماعت کو مستقل مؤثر سیاسی قوت میں ڈھالنے میں ناکامی ہوئی۔ ڈاکٹر خرم الیاس اس تقسیم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جمعیت علماء پاکستان کی فکری طاقت تو قابلِ ستائش ہے مگر اس کی تنظیمی کمزوری، باہمی قیادت کا فقدان اور جدید میڈیا سے دوری نے اس کے اثرات کو محدود کر دیا ہے۔ اگر یہ جماعت اپنی قیادت کو وحدت میں لاتی اور جدید تقاضوں کے مطابق خود کو ہم آہنگ کرتی، تو بریلوی مکتبِ فکر کے لیے ایک مؤثر آواز بن سکتی تھی۔"[18]

جمعیت علماء پاکستان نے اپنی معاصر حکمت عملی کے ذریعے مذہبی سیاست میں عشقِ رسول، ناموسِ رسالت اور عوامی دینی شعائر کے بیانیے کو مضبوط کیا۔ اگرچہ انتخابی سیاست میں اس کی حیثیت محدود رہی، لیکن نظریاتی اثر، عوامی قبولیت اور دینی اجتماعات کے ذریعے معاشرتی سطح پر اس کا کردار مسلسل جاری رہا۔ اس جماعت کی کامیابی کا مرکز اس کی عقیدت پر مبنی عوامی سیاست اور کمزوری کا پہلو اس کی تنظیمی تقسیم اور میڈیا سے عدم ہم آہنگی رہی۔ مستقبل میں یہ جماعت اگر جدید سیاسی و تنظیمی تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال سکے، تو دوبارہ ایک معتدل، مؤثر اور نظریاتی دینی قوت بن سکتی ہے۔

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث پاکستان کی حکمتِ عملی اور اثرات

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث پاکستان ایک ایسا مذہبی و سیاسی فورم ہے جو کتاب و سنت کی بالادستی، سلفِ صالحین کے منہج کی پیروی اور غیر مقلدانہ تعبیرِ دین پر زور دیتا ہے۔ اس جماعت کی فکری بنیاد اہلِ حدیث مکتبِ فکر کی دینی روایت پر رکھی گئی ہے، جو برصغیر میں شاہ ولی اللہ دہلوی، سید نذیر حسین دہلوی اور مولانا محمد حسین بٹالوی جیسے علمی اکابرین کے فکری تسلسل کی نمائندہ ہے۔ سیاسی سطح پر اس جماعت نے محدود مگر منظّم انداز میں شرکت کی اور اپنی دعوتی قوت کو علمی، تحریکی اور منظّم شکل دی۔ مولانا ساجد میر کی قیادت میں جماعت نے معاصر سیاسی منظر نامے میں پارلیمانی عمل کا حصہ بننے کے ساتھ ساتھ مذہبی حلقوں میں اعتدال و فہم کی فضا کو فروغ دینے کی کوشش کی۔

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کی معاصر حکمتِ عملی کا ایک اہم پہلو انتخابی سیاست میں شرکت کے ساتھ ساتھ اصولی مؤقف کا برقرار رکھنا ہے۔ جماعت نے ہمیشہ انتخابی عمل کو قبول کیا اور مختلف سیاسی اتحادوں میں شامل ہو کر اپنی موجودگی برقرار رکھی، تاہم اس نے اپنی نظریاتی حدود کے اندر رہتے ہوئے سیاست کی۔ مولانا ساجد میر نے کئی بار سینیٹ اور قومی اسمبلی میں جماعت کی نمائندگی کی، لیکن جماعت نے کبھی اقتدار پرستی یا موقع پرستی کی سیاست اختیار نہیں کی۔ اس حکمت عملی کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر شفیق الرحمٰن لکھتے ہیں:

"مرکزی جمعیت اہلِ حدیث نے ایک منظّم، اصولی اور باوقار سیاسی حکمتِ عملی اختیار کی۔ انہوں نے انتخابات میں شمولیت کو دعوتی ضرورت اور اجتماعی مفاد کا تقاضا سمجھا مگر اس کے لیے اپنی فکری اساس یا دینی موقف کو قربان نہیں کیا۔ ان کی سیاست کو اگرچہ قومی سطح پر بڑی کامیابی نہ ملی مگر اس کا وقار اور علمی ساکھ ہمیشہ برقرار رہی۔"[19]

دعوتی و علمی میدان میں اہلِ حدیث جماعت کی سب سے بڑی حکمت عملی تعلیم و تربیت کے ادارے اور مدارس کا مضبوط نیٹ ورک قائم کرنا ہے۔ ملک بھر میں جامعۃ السلام، جامعہ سلفیہ، دارالحدیث اور دیگر سینکڑوں ادارے اسی جماعت کی دعوتی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جو نہ صرف قرآن و حدیث کی تدریس کا کام انجام دے رہے ہیں بلکہ فکری تربیت، مناظراتی مہارت اور عصری موضوعات پر مہذب بیانیہ بھی فراہم کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر احسن شفیع اس بارے میں یوں رقم طراز ہیں:۔

"اہلِ حدیث جماعت کی اصل قوت اس کے مدارس اور علمی مراکز ہیں۔ ان اداروں نے نہ صرف ایک منظّم نصابِ تعلیم مرتب کیا، بلکہ قرآن و حدیث کی بنیاد پر جدید مسائل پر غور و فکر کے دروازے بھی کھولے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ حدیث قیادت کا لب و لہجہ متوازن، علمی اور دلیل پر مبنی ہوتا ہے جو موجودہ دینی و سیاسی انتشار میں ایک واضح امتیاز ہے۔"[20]

معاصر دور میں اس جماعت نے سوشل میڈیا، علمی مجلات اور بین الاقوامی روابط کے ذریعے اپنی دعوتی حکمت عملی کو وسعت دی ہے۔ جماعت کے علماء یوٹیوب، فیس بک اور دیگر پلیٹ فارمز پر قرآن و حدیث کے موضوعات پر بیانات، سوال و جواب اور علمی مناظرے پیش کرتے ہیں، جو خاص طور پر تعلیم یافتہ شہری طبقے کو متوجہ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سعودی عرب اور خلیجی دنیا سے تعلقات نے اسے مالی، تعلیمی اور دعوتی سطح پر نئی قوت عطا کی ہے۔ ان پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا عبدالخالق الندوی لکھتے ہیں:

"مرکزی جمعیت اہلِ حدیث نے جدید ذرائع ابلاغ سے فائدہ اٹھا کر اپنی دعوتی رسائی کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر پھیلایا۔ ان کے علماء کے علمی بیانات اور مدلل طرزِ استدلال نے شہری نوجوانوں میں قرآن و حدیث سے براہِ راست تعلق کو

فروغ دیا، جو جدید تعلیم یافتہ نسل کے لیے خاص کشش رکھتا ہے۔"[21]

معاشرتی اثرات کے حوالے سے اگرچہ اس جماعت کی سٹریٹ پاور محدود ہے اور یہ جماعت بڑے احتجاجی مظاہروں یا دھرنوں میں نمایاں نہیں ہوتی، تاہم عوامی سطح پر تعلیم، صحت اور خطباتِ جمعہ کے ذریعے فکری اصلاح کا عمل جاری رکھے ہوئے ہے۔ مساجد کی سطح پر اہلِ حدیث خطیب قرآن وسنت کی روشنی میں معاصر سماجی موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں اور معاشرے میں اصلاح عقائد، ترکِ بدعات اور خالص اسلامی تصورِ عبادت کے فروغ کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث پاکستان نے معاصر دور میں ایک باوقار، علمی اور دعوتی حکمتِ عملی اختیار کی جس میں سیاسی عمل میں شرکت، دینی تعلیم وتربیت، جدید ذرائع سے استفادہ اور فرقہ واریت سے اجتناب جیسے پہلو نمایاں ہیں۔ اگرچہ انتخابی میدان میں جماعت کی کامیابی محدود رہی تاہم فکری اثر، تنظیمی ساکھ اور دعوتی رسائی نے اسے پاکستان کی معتدل ترین دینی جماعتوں میں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ اگر یہ جماعت اپنی علمی فعالیت کو سیاسی حکمتِ عملی سے جوڑنے میں مزید مہارت حاصل کرے تو یہ ایک متوازن دینی تحریک کا کامیاب ماڈل بن سکتی ہے۔

تحریک لبیک پاکستان کی حکمتِ عملی اور اثرات

تحریک لبیک پاکستان (TLP) پاکستان کی دینی سیاست میں وہ جماعت ہے جو معاصر دہائی میں بنیادی طور پر احتجاجی سیاست، مذہبی جذبات اور ناموسِ رسالت ﷺ کے بیانیے پر قائم ہوئی۔ یہ جماعت مولانا خادم حسین رضوی کی قیادت میں 2015ء میں منظرِ عام پر آئی، جب ممتاز قادری کی سزائے موت کے خلاف ملک گیر احتجاج نے ایک نئے مذہبی تحریکی رجحان کو جنم دیا۔ تحریک نے ریاست، آئین اور قانون کی حدود کے اندر رہتے ہوئے احتجاج کو ایک ایسا سیاسی ہتھیار بنایا جو جذباتی مذہبی بیانیے کے ساتھ شدید عوامی حمایت حاصل کر سکے۔ اس جماعت کی معاصر حکمتِ عملی کو سمجھنے کے لیے اس کے عوامی دائرۂ اثر، تنظیمی ساخت، احتجاجی مظاہر اور ریاستی ردعمل کے تجزیے ضرورت ہے۔

TLP کی سب سے نمایاں حکمتِ عملی مذہبی جذبات کو عوامی سیاست میں متحرک کر کے فوری اور شدید احتجاجی ردعمل پیدا کرنا ہے۔ جماعت نے توہینِ رسالت، فرانس میں گستاخانہ خاکوں اور ختم نبوت سے متعلق حساس معاملات پر بارہا ملک گیر دھرنے، لانگ مارچ اور سڑکوں کی بندش کا طریقہ اپنایا۔ ان دھرنوں کی شدت اور عوامی شرکت نے ریاستی اداروں کو بارہا اپنی پالیسیوں پر نظرثانی پر مجبور کیا۔ ڈاکٹر حسن نثار اس حکمتِ عملی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تحریک لبیک نے مذہبی جذبات کو احتجاجی حکمتِ عملی سے اس طرح جوڑا کہ وہ ریاستی پالیسی پر براہِ راست اثر ڈالنے کے قابل ہو گئی۔ خادم رضوی کی خطابت، مذہبی زبان اور دلوں کو جھنجھوڑ دینے والی اپیل نے ایک عام مسلمان کے عقیدۂ ناموسِ رسالت کو سیاسی مطالبہ میں بدل دیا۔ یہ طرزِ عمل اس قدر مؤثر رہا کہ ریاست کو بارہا گھٹنے ٹیکنے پڑے۔"[22]

تحریک لبیک کی دوسری معاصر حکمت عملی سٹریٹ پاور کے ذریعے حکومتی نظام پر دباؤ ڈالنا ہے۔ اس جماعت نے جلسوں، جلوسوں، لانگ مارچز اور مذہبی اجتماعات کو احتجاجی تحریکوں میں اس مہارت سے بدلا کہ پولیس، رینجرز اور ریاستی مشینری اس کے سامنے بے بس نظر آنے لگی۔ 2017ء کا فیض آباد دھرنا، جس میں حکومت نے فوج کی ثالثی سے معاہدہ کیا، TLP کی احتجاجی قوت کی پہلی بڑی کامیابی تھی۔ اس دھرنے نے TLP کو صرف عوامی حلقوں میں مقبول نہیں کیا بلکہ ریاستی بیانیے میں بھی اہم بنا دیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر فوزیہ شاہین لکھتی ہیں:

"TLP کا فیض آباد دھرنا ریاست کے لیے ایک امتحان بن گیا۔ اس جماعت نے ایک واضح، مخصوص اور جذباتی بیانیہ لے کر حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی پالیسی اور رائے پر نظرثانی کرے۔ اگرچہ یہ حکمت عملی جمہوری تسلسل کے لیے چیلنج تھی، لیکن دینی جذبات کے نام پر عوامی طاقت کے لیے کارگر صورت تھی۔"[23]

تحریک لبیک کی معاصر حکمت عملی میں ایک اور پہلو شدید نعرہ بازی، مسلکی شعائر اور عشقِ رسول ﷺ کے بیانیے کو سیاسی رنگ دینا ہے۔ "لبیک یا رسول اللہ ﷺ" کے نعرے کو جماعت نے اپنے ہر احتجاج، ہر جلسے اور ہر انتخابی مہم کا عنوان بنایا۔ یہ نعرہ محض مذہبی وابستگی نہیں بلکہ سیاسی مزاحمت، دینی تشخص اور ریاستی رویے کے خلاف عوامی بیانیہ بن چکا ہے۔ ڈاکٹر عارف حسین اس پہلو پر تبصرہ کرتے ہیں:

"لبیک کا بیانیہ مذہبی سیاست میں ایک نئی روح کے طور پر ابھرا ہے۔ عشقِ رسول ﷺ کو محض عقیدت کا مظہر نہیں بلکہ سیاسی مطالبے کا ذریعہ بنانا اور پھر اس پر عوام کو منظّم کرنا، TLP کی وہ حکمت عملی ہے جو نظریے کو طاقت میں بدلنے کی کلاسیکی مثال ہے۔ یہ جماعت مذہبی جذبات کو تنظیمی طاقت میں بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔"[24]

سیاسی شرکت کی سطح پر TLP نے 2018ء کے عام انتخابات میں غیر معمولی کارکردگی دکھائی، خاص طور پر شہری علاقوں میں۔ لاہور، کراچی، فیصل آباد اور راولپنڈی جیسے بڑے شہروں میں جماعت نے ہزاروں ووٹ حاصل کیے، اگرچہ کوئی نشست حاصل نہ ہو سکی۔ یہ مظہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جماعت نے صرف احتجاج تک محدود نہ رہتے ہوئے انتخابی سیاست میں بھی قدم رکھا اور وہ طبقہ جو روایتی دینی جماعتوں سے مایوس تھا، اس کا ووٹ TLP کی جانب منتقل ہونے لگا۔ ڈاکٹر عابد الرحمٰن اس کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

"تحریک لبیک نے ثابت کیا کہ وہ محض احتجاجی تحریک نہیں بلکہ ایک سیاسی قوت بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے امیدواروں کو ملنے والے ووٹ، خصوصاً شہری متوسط طبقے سے، اس بات کا اشارہ ہیں کہ مذہبی عقائد سے جڑے عوامی جذبات جب نظم وضبط کے ساتھ پیش کیے جائیں تو وہ پارلیمانی سیاست میں بھی مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔"[25]

تنظیمی ساخت کے لحاظ سے TLP نے اپنا دائرۂ کار نہایت منظّم انداز میں پھیلایا ہے۔ اس کے شعبہ جات مثلاً لبیک یوتھ، لبیک میڈیا، لبیک خواتین ونگ وغیرہ پورے ملک میں متحرک ہیں۔ جماعت نے جدید ٹیکنالوجی، سوشل میڈیا اور موبائل ایپلی کیشنز کو بھرپور طریقے سے استعمال کیا ہے۔ اس کا بیانیہ نہ صرف اردو بلکہ پنجابی، پشتو اور سرائیکی زبانوں میں بھی پھیلایا جاتا ہے جو مختلف لسانی حلقوں تک اس کی رسائی کو ممکن بناتا ہے۔

البتہ TLP کی حکمتِ عملی پر تنقید بھی کی جاتی ہے، خاص طور پر ریاستی اداروں سے تصادم، ٹریفک بندش، عوامی املاک کو نقصان اور پرتشدد بیانیے کے باعث۔ سپریم کورٹ کے جج جسٹس قاضی فائز عیسیٰ نے فیض آباد دھرنے پر ازخود نوٹس کیس میں ریاستی اداروں کے TLP سے رویے کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس حوالے سے افتخار نور کا تجزیہ نہایت اہم ہے:

"تحریک لبیک کی احتجاجی طاقت نے اگرچہ ریاست کو بارہا اپنی پالیسی پر نظرثانی پر مجبور کیا، مگر اس کی حکمت عملی نے شہری نظم، معیشت اور داخلی سلامتی کو بھی چیلنج کیا۔ اس جماعت کو عوامی طاقت کے ساتھ ذمہ داری کا توازن سیکھنا ہوگا، ورنہ اس کی سیاسی ممکنات محدود ہو جائیں گی۔"[26]

تحریک لبیک پاکستان نے معاصر مذہبی سیاست میں ایک نیا ماڈل متعارف کروایا یعنی عشقِ رسول ﷺ کے بیانیے کو

احتجاجی طاقت، عوامی حمایت اور سیاسی دباؤ میں بدلنا۔ اس کی حکمتِ عملی مؤثر اور منظّم رہی، مگر ساتھ ساتھ اس پر ریاستی تصادم، پر تشدد رویے اور حکومتی بے چینی کا بھی سایہ رہا۔ یہ جماعت اگر اپنی تنظیمی طاقت کو حکمت، برداشت اور فکری پختگی کے ساتھ جوڑ سکے، تو پاکستانی دینی سیاست میں ایک دیرپا اور جمہوری کردار ادا کر سکتی ہے۔

سنی تحریک پاکستان کی حکمتِ عملی اور اثرات

سنی تحریک پاکستان اہلِ سنت (بریلوی مکتبِ فکر) کی ایک ایسی سیاسی و مذہبی تنظیم ہے جو ابتدا میں صرف تحفظِ مزارات، عقیدۂ ختمِ نبوت اور ناموسِ رسالت ﷺ جیسے حساس مذہبی امور کے دفاع کے لیے ابھری لیکن وقت کے ساتھ اس نے خود کو ایک مکمل سیاسی جماعت کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ جماعت کی بنیاد 1990ء کے عشرے میں محمد ثروت اعجاز قادری نے رکھی اور یہ جماعت 2006ء کے بعد زیادہ فعال نظر آنے لگی، جب کراچی میں اس کے مرکزی قائدین دہشت گردی کا نشانہ بنے۔ یہ واقعہ سنی تحریک کے لیے ایک موڑ ثابت ہوا، جس کے بعد جماعت نے اپنے تنظیمی ڈھانچے، عوامی رابطے اور سیاسی مطالبات کو زیادہ سنجیدہ شکل دینا شروع کی۔

سنی تحریک کی معاصر حکمتِ عملی میں سب سے نمایاں پہلو سٹریٹ پاور، مذہبی عقیدت اور مزاراتِ اولیاء کے تقدس کے بیانیے کو سیاسی شعور میں ڈھالنا ہے۔ اس جماعت نے مذہبی جلوسوں، محافلِ میلاد اور عوامی اجتماعات کو احتجاجی و سیاسی مقاصد کے ساتھ مربوط کیا اور عوام کو یہ پیغام دیا کہ اہلِ سنت کی مذہبی شناخت کو سیاسی سطح پر بھی ایک مستحکم آواز درکار ہے۔ ڈاکٹر علی عباس جلال پوری اس طرزِ سیاست کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سنی تحریک نے بریلوی مکتبِ فکر کی مذہبی تہذیب کو محض نعتیہ مشاعروں یا محافلِ میلاد تک محدود رکھنے کے بجائے، اسے احتجاجی اور سیاسی بیان کا ذریعہ بنایا۔ ان کا بیانیہ روایتی مذہبی محبت اور مزاراتِ اولیاء کے تقدس سے شروع ہو کر قومی پالیسیوں، انتخابی عمل اور اقلیتوں کے تحفظ جیسے نکات تک پہنچتا ہے جو اسے ایک مذہبی جماعت سے آگے لے جاتا ہے۔"[27]

سیاسی میدان میں سنی تحریک نے اگرچہ بڑی جماعتوں کی طرح الیکشن کامیابی حاصل نہیں کی، لیکن بلدیاتی و شہری سیاست میں اپنا حلقہ اثر ضرور قائم کیا ہے خصوصاً کراچی، لاہور، حیدرآباد اور فیصل آباد جیسے شہروں میں۔ ان شہروں میں سنی تحریک نے مقامی علماء، خطبا اور مزارات سے منسلک طبقات کو منظّم کر کے ایک محدود مگر منسلک ووٹ بینک پیدا کیا ہے۔ 2013ء اور 2018ء کے انتخابات میں اس جماعت نے کئی حلقوں سے امیدوار کھڑے کیے اور گو کہ نشستیں حاصل نہ ہو سکیں، تاہم ووٹوں کی تعداد نے جماعت کی موجودگی کو واضح کیا۔ ڈاکٹر آصف الیاس کے مطابق:

"سنی تحریک ایک ایسی تنظیم ہے جو انتخابی عمل میں شرکت کے باوجود خود کو مذہبی احتجاج اور اخلاقی بیانیے کی جماعت کے طور پر پیش کرتی ہے۔ اگرچہ اس نے کوئی فیصلہ کن سیاسی کامیابی حاصل نہیں کی لیکن بریلوی عوامی مذہبی جذبات کو سیاسی انداز میں منظّم کرنے کی اس کوشش نے مذہبی سیاست کا رخ ضرور تبدیل کیا ہے۔"[28]

سنی تحریک کی معاصر حکمتِ عملی میں ایک اور نمایاں عنصر فرقہ وارانہ تحفظات اور ردِ تشیع یا ردِ دیوبندیت کا بیانیہ ہے، جسے جماعت کھلے لفظوں میں بیان نہیں کرتی، لیکن اس کے اجتماعات، نعروں اور فکری حوالوں میں غیر محسوس انداز میں موجود رہتا ہے۔ اس جماعت نے اہلِ سنت کے جذبات کو اس طرح منظّم کیا کہ وہ اپنے آپ کو اقلیت یا دباؤ کا شکار محسوس کرنے لگے اور اس سے ایک دفاعی اور پھر حملہ آور سیاسی مزاج پیدا ہوا۔ ڈاکٹر نعمان عزیز اس پہلو پر تبصرہ کرتے ہیں:

"سنی تحریک نے اہلِ سنت کی شناخت کو خطرے سے دوچار بتا کر عوام میں ایک مذہبی اضطراب پیدا کیا اور اسی اضطراب کو اپنی سیاسی توانائی میں بدلا۔ اس عمل میں مذہبی رواداری کا نقصان ضرور ہوا لیکن تحریک کی تنظیمی طاقت اور عوامی بیس مضبوط ہوتی گئی۔"[29]

تنظیمی اعتبار سے سنی تحریک نے شعبہ خواتین، شعبہ نوجوانان، شعبہ مبلغین اور سوشل میڈیا ٹیموں کے ذریعے ایک مربوط ڈھانچہ قائم کیا ہے، جو جماعت کی موجودگی کو صرف مساجد یا مدارس تک محدود نہیں رہنے دیتا۔ اس کے جلسوں میں مذہبی جذبات، نعت خوانی اور خطابات کا مخصوص روحانی رنگ عوامی شرکت کو آسان بناتا ہے۔ یہی اس جماعت کی قوت ہے کہ وہ علمی یا مناظراتی بیانیے کے بجائے عوامی وجذباتی سطح پر مذہبی جذبات کو چارج کرتی ہے۔

معاصر دور میں سنی تحریک کی حکمت عملی میں ایک نئی جہت قومی و بین الاقوامی سطح پر اسلاموفوبیا کے خلاف مؤقف اختیار کرنا بھی شامل ہے۔ فرانس کے گستاخانہ خاکوں اور مغربی دنیا میں اسلام کے خلاف بیانیے پر جماعت نے کئی بار پریس کانفرنسز، مظاہرے اور احتجاجی مارچ کیے۔ اس تناظر میں مولانا ثروت اعجاز قادری کی تقاریر نے قومی میڈیا پر جگہ بنائی۔ ڈاکٹر اشفاق جاوید کے مطابق:

"سنی تحریک نے مغرب کی جانب سے اسلامی مقدسات کی توہین پر جس شدت سے ردعمل دیا اس نے جماعت کو عالمی سطح پر دینی غیرت کا ایک عوامی ترجمان بنا دیا۔ ان کے احتجاجی بیانات، قراردادیں اور عوامی اجتماعات نے اس بیانیے کو مذہبی طبقے سے نکال کر عوامی فہم کا حصہ بنا دیا۔"[30]

البتہ سنی تحریک کو کئی چیلنجز بھی درپیش ہیں۔ ان میں سب سے بڑا مسئلہ بریلوی مکتبِ فکر کی تقسیم شدہ قیادت ہے، جس کی وجہ سے جماعت قومی سطح پر اتفاقِ رائے سے محروم رہی۔ نیز، جماعت کی نظریاتی گہرائی اور علمی ساکھ نسبتاً کمزور ہے، جو اسے جدید سیاسی بیانیے میں علمی وزن دینے سے روکتی ہے۔ عوامی مقبولیت کے باوجود سنی تحریک اب تک ایک فکری تحریک کی بجائے جذباتی ردعمل کی تنظیم سمجھی جاتی ہے۔

سنی تحریک پاکستان نے معاصر دینی سیاست میں ایک ایسا ماڈل متعارف کروایا ہے جس میں روحانی وابستگی، سٹریٹ پاور اور مذہبی عقیدت کو سیاسی دائرے میں منظّم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ جماعت نے انتخابی سیاست میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی لیکن عوامی مذہبی ثقافت میں اس کی گہری رسائی، مزارات سے وابستگی اور ناموسِ رسالت جیسے حساس مسائل پر فعال بیانیہ، اسے دینی سیاست میں ایک منفرد شناخت عطا کرتا ہے۔ اگر یہ جماعت علمی ادارہ جاتی ترقی، قیادت کے استحکام اور فکری مزاحمت کے میدانوں میں ترقی کرے، تو اہلِ سنت کی ایک مؤثر نمائندہ سیاسی قوت بننے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں معاصر سیاسی منظر نامے میں مختلف حکمت عملیوں کے ذریعے ریاست و معاشرے پر اثرانداز ہونے کی سعی کرتی رہی ہیں۔ جماعت اسلامی نے ایک منظّم فکری ڈھانچے، تربیت یافتہ کارکنان اور انتخابی اصولیت کے ساتھ قومی سیاست میں نظریاتی بیانیہ قائم رکھا، گو کہ اسے انتخابی کامیابیاں محدود حد تک حاصل ہوئیں۔ اس کے برعکس جمعیت علماء اسلام (ف) نے انتخابی سیاست، پارلیمانی اتحاد سازی اور مدارس کے سماجی نیٹ ورک کے ذریعے اپنی موجودگی کو مؤثر رکھا اور سٹریٹ پاور کے ساتھ ریاستی اداروں پر مذاکراتی دباؤ بھی پیدا کیا۔ جمعیت علماء اسلام (س) کی حکمت عملی دارالعلوم حقانیہ کی فکری و تنظیمی طاقت، افغان جہادی بیانیے کی ہم نوائی اور محدود سیاسی شمولیت پر مرکوز رہی، تاہم سمیع الحق کی شہادت کے بعد یہ

جماعت قیادت کے بحران کا شکار ہو گئی۔

جمعیت علماء پاکستان نے بریلوی مکتبِ فکر کی نمائندہ جماعت کے طور پر ناموسِ رسالت ﷺ، عشقِ رسول ﷺ اور دینی شعائر کے تحفظ کو اپنی سیاسی حکمت عملی کا مرکز بنایا۔ اگرچہ اس جماعت کی تنظیمی تقسیم اور قیادت کی افتراق نے اسے سیاسی سطح پر کمزور کیا، تاہم فکری اور عوامی اثر آج بھی موجود ہے۔ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث نے علمی، دعوتی اور منظّم تعلیمی نیٹ ورک کے ذریعے ایک متوازن اور مہذب دینی سیاسی کردار پیش کیا۔ اس کی انتخابی شرکت محدود رہی، مگر علمی بیانیے، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور جدید ذرائع ابلاغ سے دعوتی استفادے نے اسے ایک باوقار شناخت دی۔

تحریک لبیک پاکستان نے معاصر دینی سیاست میں عشقِ رسول ﷺ، ناموسِ رسالت ﷺ اور ختمِ نبوت کے جذباتی بیانیے کو احتجاجی قوت اور عوامی دباؤ میں تبدیل کر کے ریاست کو متعدد بار پالیسی تبدیلی پر مجبور کیا۔ اس کی سٹریٹ پاور، نعرہ بازی اور تنظیمی نظم نے اسے ایک قابلِ ذکر تحریک بنا دیا، گو کہ اس کا پر تشدد مزاج اور شدتِ احتجاج جمہوری نظام کے لیے سوالیہ نشان بھی بنتا رہا۔ سنی تحریک پاکستان نے بریلوی عوامی مذہبی کلچر، محافل میلاد اور مزاراتِ اولیاء کی عقیدت کو ایک دفاعی اور پھر سیاسی بیانیے میں بدلا۔ اس جماعت نے عوامی سطح پر جذباتی وابستگی کو اپنی بنیاد بنایا، تاہم علمی گہرائی، قیادت کا استحکام اور انتخابی اثر پذیری میں اب بھی اسے کئی چیلنجز درپیش ہیں۔

یہ تمام جماعتیں اپنے اپنے مکتبِ فکر، مذہبی تشخص اور سیاسی حکمت عملی کے ساتھ پاکستانی ریاستی ڈھانچے، عوامی مذہبی مزاج اور پارلیمانی و احتجاجی سیاست میں اپنا اثر چھوڑتی رہی ہیں۔ ان میں سے بعض جماعتیں فکری استقامت اور تنظیمی نظم کا مظہر ہیں، تو بعض عوامی طاقت، سٹریٹ پریشر، یا مدرسہ نیٹ ورک کی بنیاد پر نمایاں ہوئیں۔ ہر جماعت کا طریقہ مختلف، مگر ریاستی و معاشرتی اثر کا انداز اپنی جگہ اہم ہے۔ یہ تنوع اس امر کا غماز ہے کہ پاکستان کی دینی سیاست نہ تو یک رخ ہے، نہ ہی محض بیانات اور جلوسوں تک محدود، بلکہ یہ ایک پیچیدہ، حکمت واثرات سے بھرپور اور مسلسل ارتقا پذیر مظہر ہے۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

حواشی و حوالہ جات

1۔ عبدالحفیظ خان، اسلامی تحریکوں کا میڈیا وژن، قلم پبلشرز، لاہور، 2022ء، ص98

2۔ خلیل الرحمٰن چشتی، پاکستان میں دینی جماعتوں کا تربیتی نظام، الفرقان پبلیکیشنز لاہور، 2019ء، ص150

3۔ یٰسین ظفر، اسلامی رفاہی تحریکیں اور جدید دور، معارف الاسلامیہ، کراچی، 2020ء، ص217

4۔ سلمان احمد، پاکستان میں دینی سیاست کا فکری تجزیہ، دارالکتاب، لاہور، 2021ء، ص167

5۔ نعمان احمد، مفتی، اسلامی سیاست اور فقہی ہم آہنگی، المدینہ پبلیکیشنز کراچی، 2020ء، ص79

6۔ شاہد حسن رضوی، پاکستان میں مذہبی سیاست کا ارتقائی جائزہ، جامعہ معارف الاسلامیہ، کراچی، 2020ء، ص183

7۔زاہد منیر عامر، ڈاکٹر، پاکستان کی دینی سیاست: ادارہ جاتی و فکری تجزیہ، ادارہ معاصر علوم، اسلام آباد، 2019ء، ص151
8۔خالد علی خان، مذہبی جماعتیں اور پاکستانی سیاست، دارالاحکام، لاہور، 2021ء، ص109
9۔عبدالشکور علوی، پاکستانی دینی قیادت کا سیاسی کردار، جامعہ علوم اسلامیہ، فیصل آباد، 2021ء، ص117
10۔معراج الحق، ڈاکٹر، دینی جماعتیں اور خاجہ پالیسی، معاصر فکریات پبلیکیشنز، لاہور، 2020ء، ص134
11۔عبدالحفیظ خان، اسلامی تحریکوں کا میڈیا وژن، ص104
12۔احمد رفعت، ڈاکٹر، مدارس، جہاد اور سیاست، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھنکنگ، اسلام آباد، 2019ء، ص141
13۔نعمان رشید، ڈاکٹر، پاکستان کی مذہبی جماعتیں اور قیادت کا بحران، ادارہ معاصر، کراچی، 2021ء، ص89
14۔نعیم احمد، ڈاکٹر، پاکستان میں مذہبی بیانیہ اور ریاستی قانون سازی، ادارہ معاصر فکر، لاہور، 2021ء، ص174
15۔طارق جاوید، ڈاکٹر، پاکستان کی مذہبی سیاسی جماعتیں: تقابل و تجزیہ، جامعہ الرشید ریسرچ سینٹر،
16۔افتخار نور، سید، معاصر چیلنجز اور دینی قیادت، البدر پبلیکیشنز، لاہور، 2021ء، ص151
17۔بشیر احمد، مفتی، قادری، علماء سیاست و ریاست، مکتبہ قادریہ، فیصل آباد، 2022ء، ص93
18۔خرم الیاس، ڈاکٹر، دینی جماعتوں کی تنظیمی ساخت، مجلس تحقیق وافکار، اسلام آباد، 2023ء، ص121
19۔شفیق الرحمٰن، ڈاکٹر، پاکستان میں دینی جماعتوں کی پارلیمانی سیاست، جامعہ علوم القرآن، لاہور، 2019ء، ص118
20۔احسن شفیع، ڈاکٹر، مدارس دینیہ کا فکری ارتقاء، ادارہ تعلیمات اسلامی، اسلام آباد، 2021ء، ص132
21۔عبدالخالق الندوی، مولانا، دعوت جدید ذرائع ابلاغ کے تناظر میں، مرکزِ فکریاتِ سلفیہ، کراچی، 2020ء، ص90
22۔حسن نثار، ڈاکٹر، پاکستان میں مذہبی احتجاجی سیاست، دارالفکر، لاہور، 2021ء، ص95
23۔فوزیہ شاہین، ڈاکٹر، دینی جماعتیں اور سٹریٹ پاور کی سیاست، ادارہ علوم سیاسیہ، اسلام آباد، 2020ء، ص129
24۔عارف حسین، ڈاکٹر، اسلامی تحریکوں کے سیاسی رجحانات، معاصر مطبوعات، کراچی، 2022ء، ص154
25۔عابدالرحمٰن، ڈاکٹر، پاکستان میں دینی سیاست کا نیا رجحان، المیزان پبلیکیشنز، لاہور، 2019ء، ص187
26۔افتخار نور، سید، معاصر چیلنجز اور دینی قیادت، ص157
27۔جلالپوری، علی عباس، ڈاکٹر، پاکستان کی مذہبی جماعتیں اور مذہبی سیاست کا سماجی کردار، قاسم پبلشرز، لاہور، 2021ء، ص131
28۔آصف الیاس، ڈاکٹر، مذہبی جماعتیں اور ووٹ بینک کی سیاست، ناظم پبلی کیشنز، 2020ء، ص119
29۔نعمان عزیز، ڈاکٹر، پاکستان میں مذہبی مسالک اور سیاسی بیانیے، ادارہ علم وسیاست، اسلام آباد، 2021ء، ص166
30۔اشفاق جاوید، ڈاکٹر، اسلامی تحریکیں اور عالمی بیانیے کا تعامل، مرکز تحقیق اسلامی، لاہور، 2022ء، ص104